خواجہ احمد الدین امرتسری کی تفسیر "بیان للناس" کا تنقیدی مطالعہ

(A Critical Analysis of *Bayān al li 'l-Nās* by Khwajah Ahmaduddin)

محمد ایاز*

Abstract

The proliferation of translations and commentaries of the Qur'an in Urdu is remarkable. However to understand and explain the different terms and verses of the Qur'ān, one has to be referring to various sources of writing a commentary, like the Qur'ān itself, *ḥadīth*, sayings of the Companions of the Prophet (SAW) and those of the followers of the Companions. More over, a commentator must be having lexical skills and prudence etc. The judious use of all these sources in their respective order is essential; otherwise the real message of the Holy Qur'ān will be misunderstood and misinterpreted. It is the individual responsibility of a Commentator to block and eliminate any intervening hand or language in his exegesis. Unlike other commentators, Ahmaduddin from Amritsar, India (1861-1936) in his Urdu commentary of the Qur'ān "*Bayān al- li 'l-Nās*" has used only the dictionary as a base for his commentary and thus has deviated from the established principles of exegesis. In the given article, several such opinions of him have been critically evaluated with argument.

تفسیر قرآن کے مآخذ سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے کسی آیت کی تفسیر معلوم ہو سکے۔ آیاتِ قرآنی دو قسم کی ہیں۔ بعض آیات تو اتنی صاف، واضح اور آسان ہیں کہ جو زبان جاننے والا نہیں پڑھے گا، اُن کا مطلب فوراً سمجھ میں آجائے گا، اسی لئے ایسی آیتوں کی تفسیر میں کسی اختلاف رائے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسی آیات کی تفسیر کا مآخذ تو صرف "لغتِ عرب" ہے، عربی زبان پر ماہرانہ نظر اور عقلِ سلیم اُن کا مطلب سمجھنے کیلئے کافی ہیں۔ لیکن جہاں کوئی ابہام و اجمال پایا جارہا ہو، یا آیت کسی واقعاتی پس منظر سے وابستہ ہو یا اس سے فقہی احکام مستنبط کئے جارہے ہوں، وہاں محض لغت کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، ایسی صورت میں تفسیر کی اصل بنیاد تو خود قرآن کریم، سنت نبویہؐ اور آثارِ صحابہؓ و تابعینؒ پر ہو گی، لیکن ان مآخذ کے بعد لغتِ عرب کو بھی سامنے رکھا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان ایک وسیع زبان ہے، اور اس میں ایک ایک لفظ کئی کئی معنوں کیلئے

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک تھیالوجی، اسلامیہ کالج پشاور۔

استعمال ہوتا ہے، اور ایک ایک جملے کے متعدد معنی ہوسکتے ہیں، لہٰذا صرف لغت کی بنیاد پر ان میں سے کوئی مفہوم معین کرنا مغالطوں کا سبب بن جاتا ہے، اسی بناء پر بعض حضرات نے " مطلق لغت "کو مستقل مآخذ ماننے سے ہی انکار کیا ہے، بلکہ امام محمدؒ[1] کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ وہ لغت کے ذریعے قرآن کریم کی تفسیر کو مکروہ قرار دیتے تھے، لیکن علامہ زرکشی[2] فرماتے ہیں کہ اُن کا مقصد تفسیر میں لغت کو بالکلیہ نظر انداز کرنا نہیں تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ کسی آیت کے ظاہر اور متبادر معنی کو چھوڑ کر ایسے معانی بیان کرنا ممنوع ہے جو قلیل الاستعمال اور دور دراز کار لغوی تحقیقات پر مبنی ہوں، ظاہر ہے کہ قرآن کریم عرب کے عام محاورات کے مطابق نازل ہوا ہے، لہٰذا جس جگہ قرآن و سنت یا آثارِ صحابہؓ میں سے کسی لفظ کی تفسیر موجود نہ ہو وہاں آیت کی وہ تفسیر کی جائے گی جو اہلِ عرب کے عمومی محاورات میں متبادر طور پر سمجھی جاتی ہو۔ ایسے مواقع پر اشعارِ عرب سے استدلال کرکے کوئی ایسے قلیل الاستعمال معنی بیان کرنا بالکل غلط ہے جو لغت کی کتابوں میں تو لکھے ہوئے ہیں لیکن عام بول چال میں استعمال نہیں ہوتے۔[3] ایسی آیات کی تشریح کیلئے محض زبان دانی کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے بہت سی معلومات کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے " تفسیر قرآن " کے کل چھ مآخذ ہیں: ۱۔ خود قرآن کریم، ۲۔ احادیث نبویہؐ، ۳۔ صحابہ کرامؓ کے اقوال، ۴۔ تابعین کے اقوال، ۵۔ لغتِ عرب، ۶۔ عقل سلیم۔

تفسیری ادب کا مفہوم

ادب ایک علم کا نام ہے جس کے جاننے سے کسی زبان کے بولنے سے لغزش اور خطا واقع نہیں ہوتی۔ یہ زبان سے متعلق وہ علم ہے جس میں صرف و نحو، لغت، عروض، انشا معانی اور بیان وغیرہ داخل ہیں۔[4] اس تعریف کی رو سے تفسیری ادب وہ ہے جس میں مُفسر، قرآن کریم کی تفسیر کرتے وقت صرف و نحو، لغت اور بلاغت وغیرہ فنون کو بھی موقع محل کے مطابق بروئے کار لائے اس لئے کہ تفسیر کرنے کیلئے جہاں قرآن، حدیث، آثار صحابہؓ، اقوال تابعین اور اجماع اُمت وغیرہ کی واقفیت لابدی ہے، وہاں عربی لغت کا علم بھی ناگزیر ہے۔ جب قرآن و حدیث، آثار صحابہ اور اجماع اُمت سے کسی لفظ یا آیت کا صحیح مفہوم واضح نہ ہو سکتا ہو تو پھر عربی زبان کے قواعد سے مدد لینا ازبس ضروری ہے۔ خود قرآن کریم کے اولین مخاطب صحابہ کرامؓ بھی قرآن کی تفسیر میں عربی زبان کے اسرار و رموز سے مدد لیتے تھے۔ عصر صحابہؓ میں قرآن و حدیث نبویہ کے بعد تفسیر قرآن کا تیسرا مأخذ اجتہاد و استنباط تھا۔ بکثرت صحابہؓ اپنے اجتہاد کے بل بوتے پر قرآن پاک کی تفسیر فرمایا کرتے تھے۔ اسی ضمن میں ان کے وسائل و ذرائع یہ تھے:

۱۔ عربی زبان کے اسرار و اوضاع کی پہچان

۲۔ عربوں کے اخلاق و عادات سے آشنائی۔

۳۔ نزولِ قرآن کے وقت جزیرہ عرب میں یہود و نصاریٰ کے حالات سے آگاہی۔
۴۔ قوتِ فہم و وسعتِ عقل۔[5] حاصل یہ کہ مفسر کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کی زبان (عربی) کی پوری مہارت رکھتا ہو یہ مہارت درج ذیل علوم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

۱۔ علم اللغۃ: مفردات قرآن کے مدلولات اور موقعہ استعمال کی تحقیق ہو جو علم اللغۃ کے ذریعے حاصل ہو گی۔
۲۔ علم الصرف: مفرداتِ قرآن کے لسانی تغیرات و تصرفات کا فہم علم الصرف اور اشتقاق کے ذریعے حاصل ہو گا۔
۳۔ علم النحو: مرکبات اور قرآن کریم کے جملوں کے تغیرات و تصرفاتِ حرکات اور اعراب کا تبدل علم النحو پر موقوف ہے۔
۴۔ علم البلاغۃ: قرآنی الفاظ کے انتخاب اور محل استعمال کے نکات و اسرار کا جاننا علم البلاغۃ سے حاصل ہو گا۔ اس اُصول کی ضرورت خود قرآن کریم سے ثابت ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ'' [6]
" یقیناً ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل فرمایا ہے کہ تم سمجھ سکو"۔

نیز فرمایا:

''بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ'' [7] " صاف عربی زبان میں ہے"۔

ان آیات میں تصریح ہے کہ یہ کتاب عربی زبان اور اس کے قواعد کے تحت اُتاری گئی ہے۔ اس لئے فہم قرآن اور تفسیر قران کیلئے علم اللسان یعنی عربی زبان کے تمام شعبوں کا جان لینا ضروری ہے۔ البتہ لغت کو اپنی ترتیب میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً قرآن کریم کے اندر "کنز" کی ممانعت اور اس پر بڑی وعید نازل ہوئی ہے۔ لغت میں کنز اس مال کو کہتے ہیں جو زمین کے اندر گڑا ہوا ہو۔ لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک شخص نے مکان فروخت کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کی قیمت کو احتیاط سے اپنے گھر میں گڑھا کھود کر اس میں رکھ دینا۔ اس نے عرض کیا کہ اس طرح کنز میں داخل نہ ہو جائیگا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس کی زکوٰۃ ادا کرائی جائے۔ وہ کنز میں داخل نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد ہے کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو، میں اس کا شمار جانتا ہوں، اس کی زکوٰۃ ادا کرتا رہوں اور اس میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں۔[8] اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو ابو داؤد وغیرہ نے ذکر کیا کہ حضرت ام سلمہؓ[9] فرماتی ہیں کہ میں سونے کا ایک زیور پہن رہی تھی میں نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ یہ بھی کنز میں داخل ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ " جو چیز مقدار زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز میں داخل نہیں ہے"۔[10] حاصل یہ ہے کہ جس مال کی

زکوٰۃ ادا کر دی گئی ہو وہ کنز نہیں ہے اگرچہ زمین کے اندر گاڑ رکھا ہو۔ اور جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو وہ کنز ہے اگرچہ زمین کے اوپر رکھا ہو۔ مذکورہ بالا تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ شرعی اصطلاح، لغوی اصطلاح پر مقدم ہے۔ لہٰذا قرآن کی تفسیر کرتے وقت لغوی معنی کا اعتبار اس وقت قابل قبول ہو گا جب کہ اس کا تعارض نصوص شرعیہ سے نہ آرہا ہو۔ اس لئے کہ لغت سے استناد کا نمبر قرآن، حدیث، آثار صحابہؓ اور اقوال تابعین کے بعد آتا ہے۔ لیکن خواجہ احمد الدین امرتسری[11] اس کا بالکل لحاظ نہیں رکھتے اور دوران تفسیر احادیث نبویہ اور آثار صحابہؓ کو ہر گز خاطر میں نہیں لاتے، چنانچہ اپنی تفسیر " بیان للناس" میں لکھتے ہیں:

> "نتیجہ یہ کہ رسول کریم ﷺ میں کوئی بات بھی حد بشریت سے بڑھ کر نہ تھی، بلاشبہ قرآن کریم بشریت کی حد سے بڑھ کر ہے۔ یہ قرآن مجید خدا کی طرف سے ہے نہ کہ رسولؐ کی طرف سے، پس رسول کریم کو ایسا اختیار دینا جس سے ان کی اپنی حدیثیں بھی خدا تعالیٰ کے قرآن کی مثل بن جائیں، قطعاً باطل ہے۔ جب بات یہ ہے تو حدیثیں صرف بر بناء قرآن و عقل ہی لی جاسکتی ہیں اور بس"۔[12]

> " بڑا افسوس ہے کہ اکثر مسلمان اکیلے قرآن کو کافی نہیں جانتے، وہ بخاری و مسلم کو بھی خود قرآن میں داخل کرتے ہیں اور بہانہ یہ بناتے ہیں کہ حدیثیں قرآن کی تفسیر ہیں۔ حالانکہ بہت سی حدیثوں کا قرآن کی تفسیر ہونے کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں بلکہ بہت سی حدیثیں قرآن حکیم کی تفسیر بننے کی بجائے قرآن کی تخریب کر رہی ہیں"۔[13]

نیز لکھا ہے:

> " وحی کی تفصیل بھی خدا تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ یہ کسی انسان پر اس طرح نہیں چھوڑی جاسکتی کہ اس کا کہنا بھی بمنزلہ وحی یا عین وحی قرار دے دیا جائے۔ ہاں عقلی تشریح و تفصیل ہر جگہ سے لی جاسکتی ہے"۔[14]

اس ضمن میں درج ذیل عبارت بھی ملاحظہ ہو:

" اور جب اس پر (قرآن یا صحیفہ فطرت سے) ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں (تو) تکبّر کرتا ہوا منہ پھیر لیتا ہے (کہ جاؤ میں نہیں سنتا۔ قرآن قرآن کی رٹ لگا رہے ہو۔ یہ تنہا کافی نہیں ہو سکتا، یہ تو مجمل، گونگا اور ناقص ہے۔ جب تک فلاں فلاں کتب کو جو کتاب اللہ میں شامل ہیں، اس کے ساتھ مثلہ معہٗ نہ مانا جائے' دین کامل نہیں ہو سکتا۔ افسوس یہ ہے کہ ایسی جرأت و جسارت کے

ساتھ آیات سے اعراض ہو)"۔[15] جہاں تک عربی لغت کا تعلق ہے تو خواجہ صاحب اس کا استعمال بھی انصاف سے نہیں کرتے، بلکہ اس حوالے سے غلو کے شکار ہیں۔ موصوف عربی لغت کے مقابلے میں احادیث، آثارِ صحابہ، اقوال تابعین اور اجماع اُمت کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔ جیسا کہ موصوف کے ایک مداح صوفی غلام مصطفی تبسم[16] نے لکھا ہے کہ وہ (احمد الدین) لغاتِ عرب اور کار گاہِ فطرت کے سوا کسی اسناد و استشہاد کے نیاز مند نہیں معلوم ہوتے[17]۔ اور موصوف کے شاگرد محمد حسین عرشی[18] نے لکھا ہے کہ بیان للناس کے ترجمہ میں سب سے پہلے اُصول عربیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے[19]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ موصوف عربی لغت سے استناد بھی صرف وہاں کرتے ہیں جہاں اُنہیں اپنے فکر کی تائید و حمایت حاصل ہو سکتی ہو۔ ورنہ ہر جگہ ایسا نہیں کرتے۔ درج ذیل صفحات میں تفسیر بیان للناس سے نمبر وار ایسے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن میں خواجہ صاحب اپنے فکر کو تقویت دینے کے لئے احادیث اور اقوال تابعین کے بجائے عربی لغت سے مدد لیتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ ان پر علمی بحث اور تبصرہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

1. ''وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا''[20] کا ترجمہ و تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " اور بالتحقیق ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (تاکہ اپنی قوم کو دردناک عذاب کے آنے سے پہلے ڈرائے) پس وہ اُن میں ہزار ''سن'' پچاس ''عام'' کم رہا۔ (مصباح المنیر میں لکھا ہے کہ سَن کے معنی فصل کے بھی ہیں۔ قرآن مجید میں سنین کا لفظ فصلوں کے قحط پر بھی بولا گیا ہے۔ سنین کو لوگ مختلف طرح سے گنتے تھے جیسا کہ 'مماتعدون' کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ لیکن 'عام' پورے بارہ مہینہ کے سال کو کہتے ہیں۔ حضرت نوحؑ کی عمر کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے سنہ اور 'عام' کے دونوں لفظ استعمال کر کے صاف دکھلا دیا ہے کہ سنہ اور 'عام' میں بالضرور فرق ہے۔ ورنہ عام کے لانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ سن کے معنی فصل کے ہی ہیں۔ اگر سال میں کم از کم چار فصلیں سمجھی جائیں تو ہزار فصلوں کے اڑھائی سو سال ہوئے اور جب اُن سے پچاس سال کم کر دیے جائیں تو باقی دو سو سال رہے۔ دنیا میں انسان کی عمر دو سو ادو سو سال تک پہنچتی ہوئی دیکھی گئی ہے"۔[21]

حضرت نوحؑ کا شمار اولین انبیاء میں ہوتا ہے۔ دیگر انبیاءؑ کی نسبت آپؑ کا زمانہ حضرت آدمؑ سے زیادہ قریب ہے۔ اور اس زمانے میں انسانوں کی عمریں عموماً زیادہ ہوتی تھیں۔ لہذا انہیں آج کل کے انسانوں کی عمر پر قیاس کرنا مناسب نہیں۔ محنت کا یہ طویل

عرصہ دراصل حضرت نوحؑ کی استقامت، داعیانہ صلاحیت، مضبوط قوتِ ارادی، اور پیغمبرانہ شفقت پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ اور آپؐ کی داعی امت کو ان کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس امت کے داعیانِ حق لوگوں کی مخالفت اور نتائج میں تاخیر پر بددل اور کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ اس لئے حضرت نوحؑ کا شمار اولو العزم رسل میں سے ہوتا ہے۔ لہذا خواہ مخواہ آپؑ کی محنت کے دورانیے کو گھٹانا کسی دینی و دنیوی منفعت کو مفید نہیں۔ واقعی آپؑ نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی امت کو اللہ کی طرف بلایا۔

"سن" کا لفظ قرآن میں سال ہی کے لئے لایا گیا ہے۔ یہود کی حبّ دنیا اور موت کے خائف ہونے کے حوالے سے قرآن میں ارشاد ہے: يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ [22] (ان (یہود) میں ہر ایک چاہتا ہے کہ ہزار برس عمر پاوے۔) قرآن میں " الف سنۃ' کے الفاظ آئے ہیں (یعنی ہزار سال) لہٰذا اگر موصوف کا بیان کردہ مذکورہ بالا فارمولا ہم یہاں جاری (Apply) کر لیں تو یہاں اڑھائی سو سال بنتے ہیں۔ لہٰذا اتنی عمر زندہ رہنے کی تمنا کرنا چودہ سو سال پہلے لوگوں کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اور نہ ہی یہ عرصہ حبُ ِ دنیا پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے کہ بقول موصوف دنیا میں انسان کی عمر دو سو ادو سو سال تک پہنچتی ہوئی دیکھی گئی ہے۔ تمنا تو اس چیز کی کیجاتی ہے جو حالاً آدمی کو میسر نہ ہو۔ پھر موصوف ایک طرف حضرت نوحؑ کی زمانہ محنت کو گھٹا کر اپنے محدود عقل کے مطابق لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن دوسری طرف فصلوں کی عمر کو گھٹا کر انہیں دائرہ عقل سے خارج کرتے ہیں۔ موصوف کہتے ہیں کہ ' اگر سال میں کم از کم چار فصلیں سمجھیں جائیں۔' یہ مفروضہ تو ہو سکتا ہے لیکن حقیقت نہیں ہے۔ اسلئے کہ ایک سال میں چار موسم تو عموماً ہوتے ہیں لیکن ایک ہی زمین سال میں زیادہ سے زیادہ چار فصلیں نہیں دیتی (چہ جائیکہ کم از کم چار فصلیں) ہمارے ہاں تو مشاہدہ ہے کہ نومبر تا مئی گندم کی فصل کی بوائی، حفاظت، کٹائی اور سنبھالنے میں تقریباً پانچ، چھ مہینے کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ اسی طرح جون جولائی تا اکتوبر مکئی کے فصل پر بھی تقریباً پانچ ماہ کا عرصہ لگتا ہے۔ اور دو فصلوں کے درمیان زمین کو اگلی فصل کے لئے قابل کاشت بنانے کی خاطر مختصر وقفہ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا زیادہ صحیح یہ ہے کہ ایک ہی زمین سال میں کم از کم دو فصلیں تو باآسانی دے سکتی ہے۔ لیکن تیسرے کی گنجائش اگر ناممکن نہیں تو زیادہ مشکل ضرور ہے۔ لہٰذا ایک سال میں چار فصلوں کا امکان عموماً باقی نہیں رہتا اور موصوف کا مذکورہ بالا فارمولا کسی عقلی دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ پس حضرت نوحؑ کے دعوت و تبلیغ کا زمانہ ساڑے نو سو سال تھا جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے۔ دیگر مفسرین نے بھی اس کو ساڑھے نو سو سال لکھا ہے۔ علامہ ابن کثیرؒ[23] مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ و تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ترجمہ: "ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان میں ساڑھے نو سو سال تک رہے (پھر تفسیر میں لکھتے ہیں):

"اس میں آنحضرت ﷺ کی تسلی ہے آپؐ کو خبر دی جاتی ہے کہ حضرت نوحؑ اتنی لمبی مدت تک اپنی قوم کو خدا کی طرف بلاتے رہے، دن رات پوشیدہ اور ظاہر ہر طرح آپ نے انھیں خدا تعالیٰ کے دین کی دعوت دی، لیکن وہ اپنی سرکشی اور گمراہی میں ہی بڑھتے گئے بہت ہی کم آپ پر ایمان لائے۔" [24]

مفتی محمد شفیعؒ[25] آیتِ مذکورہ کا ترجمہ و تفسیر یوں فرماتے ہیں:

" اور ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا سو وہ ان میں پچاس سال کم ایک ہزار برس رہے اور قوم کو سمجھاتے رہے (پھر اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں) سابقہ آیات میں کفار کی مخالفت اور انکی ایذاؤں کا بیان تھا جو مسلمانوں کو پہنچتی رہتی ہیں۔ آیاتِ صدر میں اس طرح کے واقعات پر رسول اللہؐ کو تسلی دینے کے لئے انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے کچھ حالات کا بیان ہے۔ کہ قدیم سے یہ سلسلہ اہل ہدایت کو کفار کی طرف سے ایذاؤں کا جاری ہے۔ مگر ان تکلیفوں کیوجہ سے انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری، اس لئے آپ بھی ایذاءِ کفار کی پرواہ نہ کریں، اپنے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں مضبوطی سے کام کرتے رہیں"[26]

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب[27] نے اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

" اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، تو وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال رہا (تفسیر میں لکھتے ہیں) حضرت نوحؑ کی ساڑھے نو سو سال عمر کا ذکر صرف اسی سورہ میں آیا ہے، عمر کی یہ تصریح اس سورہ کے عمود کے تقاضے سے ہوئی ہے۔ اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ جو لوگ حق کی راہ اختیار کریں ان کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہ جلدی سے، بغیر کوئی زحمت و مشقت جھیلے، منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ یہاں حضرت نوحؑ کی عمر کا حوالہ دیا کہ انھیں اپنی قوم کے ساتھ ایک طویل آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی حقیقت کو مبرہن کرنے کے لئے یہاں حضرت نوحؑ کی عمر کا حوالہ دیا کہ انہیں اپنی قوم کے ساتھ ایک طویل مدت تک کشمکش کرنی پڑی تب کہیں جا کر وہ اللہ تعالیٰ کے امتحان میں سرخرو اور اپنے فرض سے فارغ ہوئے۔ [28]

2. سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ''سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا---الخ'' کے تحت لکھتے ہیں:

" المسجد الاقصی کے معنی ہیں کسی قصبے کی دور کی مسجد یعنی وہ مسجد جو اس قصبے کے حدود میں سے دور کی حد پر واقع ہو۔ قرآن مجید میں ہے کہ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُل'' يَّسْعٰى۔[29] و جآء رجل من اقصا المدينة يسعٰى[30] یہاں اقصا المدینۃ کے معنی ہیں شہر کی دور کی جانب، جو اُن لوگوں سے زیادہ دور ہو جن کا آیات میں ذکر ہے۔ کسی شہر کی دور کی مسجد سے کل دنیا کی دور کی مسجد کے معنی لینا کسی طرح درست نہیں۔ کرۂ زمین پر کوئی مسجد اقصا نہیں ہو سکتی۔ اور اگر ہو سکتی ہے تو کیا اصحاب کہف کی مسجد اور زمین کی اس سے بھی زیادہ دُور کی مسجدیں اقصا نہیں کہلا سکتیں۔ بیت المقدس کی مسجد کو عام مفسرین مسجد اقصا کہتے ہیں لیکن یہ مسجد رسول کریم کے زمانہ میں موجود نہ تھی۔ اس سورت کی ساتویں آیت میں بیت المقدس کی مسجد کی مکمل تباہی کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اس کی آبادی کا کہیں بیان نہیں۔ چھٹی آیت میں اسی مسجد کا ذکر دیار کے لفظ میں لایا گیا ہے۔ اسی مسجد کے ساتھ اس مسجد اقصا کا کوئی تعلق نہیں۔" [31]

3. اسی طرح موصوف مشعر الحرام کو ہی مسجد اقصیٰ خیال کرتے ہیں۔ اس ضمن میں بنی اسرائیل :۱ کے تحت لکھتے ہیں:

" مکے کے باہر عرفات تک حج کا جلسہ ہوتا تھا پس مشعر الحرام مکے کی دور کی مسجد ہے۔ یہ مسجد حدود مکہ کی ایک انتہائی بیری کے پاس تھی اور اس کے پاس مسافروں کے آنے جانے کے لئے باغ تھا جس کو جنت الماویٰ کہتے تھے۔ پس اس مسجد کے ارد گرد ظاہری برکات بھی تھیں اور اس کے گرد مسجد الحرام اور عرفات کی حدود بھی واقع تھیں جہاں ذکر الٰہی ہوتا تھا۔ اس لئے اس کے ارد گرد باطنی برکات کا بھی ظہور ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ایک رات اپنے رسول کو اس مسجد کی طرف لے گیا۔ اسی سیر سے مقصود یہ تھا کہ حضور کو قدرتی آیات دکھلائی جائیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طورِ سینا پر آیات دکھلائی گئی تھیں۔"[32] مشعر الحرام کو مسجد اقصیٰ قرار دینے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ مسجد اقصیٰ سے وہی مبارک اور تاریخی مسجد مراد ہے جو کہ بیت المقدس (فلسطین) میں واقع ہے۔ اور جس کے آس پاس ملکِ شام کی زرخیز سرزمین ہے۔ مفسرین نے بھی مسجد اقصیٰ کا بیت المقدس میں واقع ہونا بتایا ہے اور یہ آج کل بھی وہیں موجود ہے۔ اسرائیل کے یہودیوں نے زبردستی اس پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے۔ اور فلسطین کے مسلمانوں کا آئے دن یہودیوں کے ساتھ اس کی

آزادی کے لئے جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ محض ایک فرضی بات نہیں ہے اور نہ ہی مسجد اقصیٰ سے مراد مکے کے دور کی مسجد (مشعر الحرام) ہے"

اس سلسلے میں حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے:

" اللہ تعالیٰ اپنے بندے یعنی محمد مصطفی کو ایک ہی رات کے ایک حصے میں مکے شریف کی مسجد سے بیت المقدس کی مسجد تک لے گیا۔ جو حضرت ابراھیمؑ خلیل اللہ علیہ السلام کے زمانے سے انبیاء کرام علیہم السلام کا مرکز رہا۔"[33]

اور مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

"وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ (محمد ﷺ) کو شب کے وقت مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے آس پاس (کہ ملک شام ہے) ہم نے (دینی و دنیوی) برکتیں کر رکھی ہیں۔ (دینی برکت یہ ہے کہ وہاں بکثرت انبیاء مدفون ہیں اور دنیوی برکت یہ ہے کہ وہاں باغات اور نہروں، چشموں اور پیداوار کی کثرت ہے۔ غرض اسے مسجد اقصیٰ تک عجیب طور پر اس واسطے) لے گیا تاکہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلا دیں۔" مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سفر جس کا ذکر اس آیت میں ہے اس کو اسراء کہتے ہیں مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر براق پر ہوا جب دروازہ بیت المقدس پر پہنچے تو براق کو دروازہ کے قریب باندھ دیا اور آپؐ مسجد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس کے قبلہ کی طرف تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں۔" [34]

4. خواجہ صاحب طواف کے معنی 'چلت پھرت' اور طائفین سے مراد ' چل پھر کر نماز پڑھنے والے لیتے ہیں۔ درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

سورۃ الحج:۲۶ ''وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ''کا ترجمہ اور تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اور (فرمایا کہ) میرے گھر کو چل پھر کر نماز پڑھنے والوں اور کھڑے ہو کر نماز قائم کرنے والوں اور رکوع و سجدہ بجالانے والوں کیلئے پاک کر۔ (یہ تمام نمازی اس گھر کے اندر مناسب انتظام کے ساتھ نماز پڑھیں۔ مسجد کے باہر تو ضرورتاً پڑھی جاتی ہے ورنہ اصل نماز کی جگہ اس مسجد کے اندر ہی ہے۔" [35]

طواف کا مفہوم:

نیز اگلے صفحے پر سورہ الحج:۲۹(وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ) کے تحت طواف کے معنی یوں کرتے ہیں:

" اور آزاد گھر میں چلیں پھریں "۔اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نماز طواف جو خدا پر قربان ہو کر چلتے پھرتے پڑھی جاتی ہے۔اس کے لئے اس آزاد گھر کے اندر ہی جگہ ہے۔اگر اندر جگہ نہ رہے تو باہر بھی نماز ادا کی جاسکتی ہے جیسا کہ تمام نمازوں کا قاعدہ ہے"۔[36]

طواف / طائفین کا اصل مفہوم ملاحظہ ہو:

"طائفین، طائف کی جمع ہے اور لغت میں طواف کے معنی کسی چیز کے گرد پھرنے کے ہیں۔شرعی اصطلاح میں طواف سے مراد خانہ کعبہ کے گرد پھرنا اور اس کے چکر کاٹنا ہے۔اور طائفین وہ لوگ ہیں جو حج اور عمرہ کی نیت سے بیت اللہ شریف کا قصد کر کے اس کا طواف کرتے ہیں"۔[37]

5. موصوف کا خیال ہے کہ تمام مفید کام صلوٰت ہیں، اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

" (تمام مفید کام جو خدا تعالیٰ کی رضامندی کو سامنے رکھ کر کئے جاتے ہیں صلوٰت میں داخل ہیں)۔"[38]

بے شک لغوی معنی کے اعتبار سے لفظ "صلوٰۃ" کا مفہوم بہت وسیع ہے لیکن اسلامی شریعت میں صلوٰۃ اس خاص بدنی عبادت کا نام ہے جو مخصوص اوقات میں مخصوص طرز و ترتیب سے ادا کی جاتی ہے۔لغاتِ قرآن میں صلوٰۃ کے تحت لکھا ہے:

صَلٰوت، صلوٰۃ کی جمع ہے صلوٰۃ کے معنی ہیں نماز، دعا، رحمت۔ صلوٰۃ کے معنی دعا کرنے، برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے بھی ہیں۔اور وہ صلوٰۃ کہ جو عبادت مخصوصہ ہے (یعنی بمعنی نماز) اس کا اصل بھی دعا ہی ہے۔ جس طرح کہ کسی شے کو اس کے بعض اجزاء کے نام پر موسوم کر دیتے ہیں ' اسی طرح یہ عبادت یعنی نماز بھی صلوٰۃ سے موسوم ہوئی کہ دعا پر مشتمل ہے۔نماز ان عبادات میں سے ہے کہ جس سے کوئی شریعت خالی نہیں رہی، گو اس کی صورتیں شریعت کے اعتبار سے یکے بعد دیگر مختلف رہیں۔نیز عبادت خانہ کو بھی صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ صلوٰۃ کا لفظ قرآن میں ایک اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے جس کی وضاحت قرآن نے بھی کر دی ہے اور سنت نے بھی اس کی پوری وضاحت کی ہے۔علاوہ ازیں امت کے قولی و عملی تواتر نے اس کی شکل

وہیئت اور اس کے اوقات بالکل محفوظ رکھے ہیں۔ اگر اس کے کسی جزء میں کوئی اختلاف ہے تو وہ محض فروعی قسم کا ہے جس سے اصل حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حاصل یہ کہ صلوٰۃ ایک مخصوص عبادت کا نام ہے۔ دیگر مفید کاموں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ان کی ادائیگی کے اوقات، طریقہ و آداب شریعت نے مقرر کئے ہیں۔ اور ان کی پہچان کے واسطے ان کے لئے الگ الگ اصطلاحیں مقرر کی گئی ہیں جیسے زکوٰۃ، صوم، اور حج وغیرہ۔ لیکن یہ اعمال صلوٰۃ کا قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم تمام مفید کام صلوٰت میں شمار کریں (جیسا کہ موصوف کہتے ہیں) تو پھر ہر ایک انسان اپنی مرضی سے کوئی نہ کوئی مفید کام انجام دے کر اقامتِ صلوٰۃ کے فریضہ سے جان چھڑائے گا اور قرآن و سنت میں مذکور صلوٰۃ سے متعلق وعدہ اور وعید بالکل بے معنی رہ جائیں گے۔ لہٰذا سورۃ المؤمنون:۹ کے تحت موصوف کا مذکورہ بالا ترجمہ کسی طور سے بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس سے اسلام کا سارا دینی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ موصوف سے اس قسم کی غلطیاں بار بار اس لئے ہوتی ہیں کہ وہ قرآن فہمی میں نبی کریم ﷺ کے ارشادات (سنت و حدیث) کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اگر موصوف درج ذیل حدیث کو تسلیم کرتے تو قرآن میں مذکور لفظ صلوٰۃ کا مفہوم با آسانی سمجھ میں آجاتا۔

''صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي''[39] (نماز ایسی پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو)

6. موصوف اپنی طرف سے سجدہ کی تعریف یوں کرتے ہیں:

" سو جب میں اُس (جنس بشر) کو درست کروں اور اس میں اپنی روحوں میں سے (ایک روح کو) پھونکوں (اور وہ صاحب عقل و اختیار بن جائے) تو تم اس کے لئے ساجد ہو کر گر پڑنا۔ (انسان سورج سے خدا کے حکم کے برخلاف فوائد اُٹھاتا ہے اور سورج اسے مخالفت الٰہی میں بھی کام دیتا ہے۔ کسی شخص کی اس قسم کی اطاعت سجدہ کہلاتی ہے)۔"[40]

حالانکہ سجدہ بدنی عبادات میں سے ایک مخصوص رکن کا نام ہے جو ایک مخصوص شکل وہیئت سے ادا کی جاتی ہے، اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جاتا ہے۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لفظ سجدہ سے متعلق لکھا ہے:

" سجدہ" اس کا مصدر " سجود" ہے (باب نصر) جس کے لفظی معنی ماتھا یا ناک زمین پر رکھنا ہے۔ اسی سے سجادہ وہ کپڑا یا چٹائی وغیرہ ہے جس پر سجدہ کیا جائے۔ مَسْجِدْ اور مَسْجَدْ (جمع مساجد) وہ جگہ جہاں سجدہ کیا جاتا ہے۔۔۔۔ سجود الصلاۃ (سجدہ نماز) جو نماز کے ارکان میں سے ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ زمین پر ہاتھ

ٹیک کر ان کا سہارا لیا جائے اور سرین کو بلند رکھا جائے، ماتھا اس طرح زمین پر رکھا جائے کہ چہرہ دونوں ہاتھوں کے درمیان ہو اور دونوں کان ہتھیلیوں کے برابر آجائیں، سجدے میں ماتھا اور ناک دونوں کو زمین پر رکھنا افضل ہے۔[41] اس سے واضح ہوتا ہے کہ سجدہ ایک مخصوص عمل کا نام ہے۔

7. بقول موصوف فردوس' پردیس کا معرّب ہے:"الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ"[42] کے تحت لکھتے ہیں:

"(جنت میں جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے وہ ہمارے فہم سے اعلیٰ ہے۔ اس دنیا میں جنت ہمارے لئے پرائے دیس کی مانند ہے۔ فردوس، پردیس کا ہی معرب ہے)۔"[43]

خواجہ صاحب یہاں صرف غلط نہیں بلکہ الٹا سمجھے ہیں۔ سب سے پہلے انسان (حضرت آدمؑ) کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے کچھ عرصہ جنت میں رکھ کر اسے اپنا اصل ٹھکانہ عملاً دکھادیا۔ پھر دنیا میں امتحاناً بھیجا تاکہ وہاں سے کامیاب ہو کر دائمی طور پر اپنے ٹھکانے میں داخل ہو جائے۔ لہٰذا دنیا میں رہ کر جنت کو پرایا دیس تصور کرنا خلافِ عقل اور خلافِ فطرت معلوم ہوتا ہے۔ ایمان والا دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے اصلی گھر یعنی جنت کا مشتاق ہوتا ہے۔ اور دنیا کو پرایا دیس سمجھ کر اس میں جی نہیں لگاتا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے۔[44] ظاہر ہے کہ آدمی پرائے دیس کے لئے بے چین نہیں ہوتا، اور نہ ہی اس کے لئے اتنی محنت کرتا ہے۔ پھر ازروئے قرآن، جنت میں دخول ہمیشہ کے لئے ہو گا اور پرائے دیس میں آدمی کا دائمی دخول ممکن نہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جب جنت مانگو تو جنت الفردوس مانگو وہ سب سے اعلیٰ اور اوسط جنت ہے۔ وہیں سے جنت کی سب نہریں جاری ہوتی ہیں۔ اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔[45]

لہٰذا دنیا میں محنت کر کے کیا ہم اللہ تعالیٰ سے پرایا دیس مانگیں گے اور کیا اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو کر ہمیں کسی دوسرے کا پرایا دیس دیں گے۔ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے مالکانہ حقوق کے ساتھ جنت عطا فرما کر مہمان نوازی کریں گے۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ، نُزُلًا مِنْ غَفُورٍ رَحِيمٍ"[46]

لہٰذا موصوف کا یہ تصور خلافِ حقیقت ہے کہ دنیا میں رہ کر جنت ہمارے لئے پردیس کی مانند ہے۔ اس لئے کہ پردیسی عموماً دوسرے، تیسرے درجے کا شہری ہوتا ہے اور ان کے منہ مانگے مطالبات ہر گز پورے نہیں کئے جاتے، جب کہ قرآن میں ہے کہ جنت میں جنتی کی ہر خواہش اعلیٰ پیمانے پر پوری ہو گی۔ جو جی میں آئے وہ بھی ملے گا اور اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے مزید بھی دیں گے: لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ[47] (ان کے لئے وہ ہو گا جو یہ چاہیں گے اور ہم اپنی طرف سے اور بھی دیں گے) ظاہر

ہے ان تمام نعمتوں سے آدمی بھرپور فائدہ اس وقت اٹھا سکتا ہے جب اس کا یہ یقین راسخ ہو کہ رہائش دائمی اور اپنی ہے، پرائی نہیں۔ دنیا کا مشاہدہ ہے کہ عرصہ دراز تک ایک ملک میں قانون کا پابند ہو کر رہنے کے بعد انسان کو وہاں کی مستقل شہریت اور نیشنلٹی (Nationality) مل جاتی ہے۔ حالانکہ یہ اس ملک پر بوجھ ہو سکتا ہے۔ تو کیا جنت میں ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں بلکہ لامتناہی مدت کے لئے داخل ہو کر مستقل شہریت اور نیشنلٹی نہیں ملے گی۔ جبکہ وہاں کسی چیز کی کمی بھی نہیں ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل حدیث اس موضوع کو اور بھی واضح کر دیگی۔ پس ثابت ہوا کہ دنیا دراصل ہمارے لئے پردیس جب کہ جنت الفردوس ہمارا اصل ٹھکانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں نصیب فرمائے۔ آمین۔

8. بقول موصوف انصار ' نصاریٰ تھے ،چنانچہ ''وَعْدَ اللَّهِ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ'' [48] کے تحت لکھا ہے:

> " اس میں ہمارے رسول کریم ﷺ کے مدینہ میں ہجرت کرنے کا ذکر ہے۔ اہل کتاب کے کئی ایک سمجھدار لوگ مدینہ میں آبسے تھے۔ وہ خدا کے مومن تھے اور اس کے حکیمانہ وحی کے سننے کا شوق رکھتے تھے۔ وہ دوسرے مہاجروں کی قدر کرتے تھے۔ اور خود تکلیف اُٹھا کر ان کو راحت پہنچاتے تھے۔ جب رسول کریم ﷺ نے ہجرت کی تو وہ مذکورہ بالا پیشگوئی کے مطابق استقبال کے لئے آئے۔ رسول کریم ﷺ کو اپنا حاکم بنایا۔ جب پورے ایک سال کے بعد قیدار کی حشمت ٹوٹی اور بدر کی فتح ہوئی تو اُن کا ایمان اور بڑھتا گیا۔ ان لوگوں میں اکثر نصاریٰ تھے، وہی اسلام کے انصار کہلائے۔ ایسے ہی لوگوں نے مسیح علیہ السلام کے وقت کہا تھا: نحن انصار اللہ۔" [49]

خواجہ صاحب انصار اور نصاریٰ کا اطلاق ایک ہی قسم کے لوگوں پر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں نام الگ الگ قسم کے لوگوں کو دئے گئے ہیں۔ انصار اہل کتاب نہیں تھے ، بلکہ مدینہ کے اصلی باشندے تھے۔ جو اہل کتاب مدینہ میں باہر سے آئے تھے وہ دراصل یہود تھے، جبکہ انصار کا تعلق بنو قحطان کے دو ذیلی قبائل اوس اور خزرج سے تھا۔ آپؐ کی ہجرتِ مدینہ سے قبل ان کے کچھ لوگ حج کے لئے مکہ معظمہ آئے تھے، اور منیٰ کے وادی میں ان کے چند افراد نے مسلمان ہو کر آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی تعلیم اور اسلام کی تبلیغ کے لئے حضرت مصعب بن عمیرؓ [50] کو ان کے ہمراہ مدینہ بھیجا۔ حضرت مصعب بن عمیر اور ان نئے مسلمانوں کی کوششوں سے تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سارے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ جن میں اوس اور خزرج کے سردار بھی شامل تھے۔ اور نبی کریم ﷺ کو مدینہ طیبہ تشریف لے جانے کی پیشکش کی۔ آپؐ کی ہجرت

کے بعد انہوں نے بے سروپا مہاجرین کی دل کھول کر مدد و نصرت کی۔ یہ نصرت اسلام کی خاطر تھی، پھر جنگوں میں بھی انہوں نے سینہ سپر ہو کر دین حق کی نصرت میں خوب جوان مردی کے مظاہرے کئے، لہٰذا اسلام اور نبی کریم ﷺ کی اس پُر خلوص اور بھرپور نصرت کرنے کی بناء پر مدینہ کے مسلمان 'انصار' کہلائے اس لئے عموماً ان کو انصارِ مدینہ کہا جاتا ہے۔ جبکہ مکہ معظمہ سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو مہاجرینِ مکہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب کہ نصاریٰ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی دعوت پر لبیک کہا تھا کہ یعنی ہم اللہ کی دین کے مددگار ہیں۔ اس وجہ سے آپؑ کے پیروکار نصاریٰ کہلائے، اور بعد میں اسی نام سے پکارے جاتے رہے اگرچہ وہ دین کی کچھ نصرت بھی نہ کرتے ہوں۔ لہٰذا اب یہ اصطلاح عیسائیت کے ساتھ مخصوص ہے۔ اب نبی کریم ﷺ کی رسالت کے بعد ان تمام اہل کتاب سے قرآن اور آخری نبی پر ایمان لانے کا مطالبہ ہے اور یہ بات ان کے لئے کوئی عجیب نہیں ہے، اس لئے کہ ان کی کتابوں میں آپ ﷺ کا تذکرہ تھا۔ لیکن ان تمام اہل کتاب میں بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے جبکہ ان کی اکثریت نافرمان رہی جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے: '' لَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ '' [51] (اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا لیکن ان میں بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے جب کہ اکثریت نافرمان رہی)۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نصاریٰ (عیسائیوں) میں جو لوگ ایمان لائے تو وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ اب وہ نصاریٰ باقی نہ رہے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ ایک آدمی بیک وقت نصرانی بھی ہو اور مسلمان بھی ہو۔ لیکن مدینہ کے جو لوگ مسلمان ہوئے، وہ انصار کہلائے، لہٰذا یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک صحابی انصاری تو ہو لیکن مسلمان نہ ہو۔ الغرض بیان للناس کے مذکورہ بالا عبارت میں خواجہ صاحب نے جن صفات کا تذکرہ کیا ہے ان کے حامل افراد دراصل انصار تھے۔ ان کو نصاریٰ پر حمل کرنا سراسر ظلم، زیادتی یا موصوف کی غلط فہمی ہے۔

9. موصوف صلوٰۃ کا عجیب ترجمہ و تفسیر کرتے ہیں چنانچہ (هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ)[52] کے تحت لکھتے ہیں:

> '' وہ اللہ تعالیٰ تمہاری بھلائی میں مصروف ہے (اور تم پر شاباش بھیج رہا ہے) صلّوا معنی بانس کو گرم کر کے سیدھا کرنے کے ہیں۔ انسانوں کو آزمائش میں ڈال کر خدا درست بناتا ہے اور دوسرے عالم میں گناہگاروں کے لئے صلّو ھم کا حکم سیدھا کرنے کے لئے ہی ہوتا ہے)'' [53]

نیز موصوف صلوٰۃ و سلام کی عجیب توجیہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ''إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ''[54] کا ترجمہ و تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تحقیق اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ کرتے ہیں (صلوٰۃ یعنی ٹیڑھے بانس کو آگ پر سیدھا کرنا) غرض اصلاح کرنا ہے۔ آپؐ کتاب و ایمان کو نہ جانتے تھے، خدا نے سب کچھ سکھایا اور دوسرے انعامات فرمائے، جن چیزوں کا علم نہ تھا وہ بتائیں اور مومنوں پر بھی۔ یہی الفاظ لاکر رسول اور غیر رسول میں مساوات دکھا کر شخصیت پرستی کی جڑ کاٹی خدا سب کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لانا چاہتا ہے"

ملاحظہ ہو فرمانِ الٰہی :

'' هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا'' [55]۔ یہ ہیں صلوٰتیں۔ یہ اصلاحات خداوند کریم اپنے تصرف سے فرماتا ہے۔ ملائکہ کارکنانِ قدرت ہیں جو حکم الٰہی سے خدمت کر رہے ہیں۔ اگر صرف نیچر پر مدار رکھا جائے تو غلطیوں کا بھی امکان رہ جاتا ہے۔ اگر تصرف الٰہی اور حکم ایزدی ہو تو غلطی کا ذرا بھی امکان نہیں۔ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا [56] نیچر اور تصرف کے درمیان یہی فرق ہے۔ غرض جب خدا اور اس کے کارکنانِ قدرت نبیؐ کی بہتری اور خیر میں لگے ہوئے ہیں، تو) اے ایماندارو! تم (بھی ہر وقت) اس (نبیؐ) کی خیر میں لگے رہو اور سلامت رکھو (اُسے) سلامت رکھنا۔" [57]

انصاف سے دیکھا جائے تو لفظ " صلوٰۃ " کے مذکورہ بالا ترجمے کی اس مقام پر کوئی گنجائش پیدا نہیں ہوتی۔ ادھر اس لفظ سے غرض اصلاح کرنا نہیں (جیسا کہ موصوف کہتے ہیں) بلکہ پیغمبر مہربان اور محسن اعظم ﷺ کی تعظیم، بلند مرتبہ اور فرشتوں کے سامنے آپؐ کی مدح و ثناء بیان کرنا مقصود ہے۔ موصوف کا یہ کہنا کہ یہ الفاظ رسول اور غیر رسول میں مساوات دکھانے اور شخصیت پرستی کی جڑ کاٹنے کے لئے استعمال ہوئے ہیں، حد درجہ ناقابل قبول ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بغض و عناد پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ان الفاظ سے تو دراصل رسول ﷺ کی اعلیٰ ترین شخصیت اور انسانوں، فرشتوں بلکہ تمام مخلوقات پر آپؐ کی فضیلت و فوقیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں تو رسول اور غیر رسول کے مساوی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایک متبوع ہے جبکہ دوسرا تابع۔ ایک مطاع ہے جبکہ دوسرا مطیع، ایک رحمۃ للعلمین ہے جبکہ دوسرا عام انسان، ایک کا مبارک نام کلمہ طیبہ، اذان و تکبیر میں بلند ہوتا ہے جبکہ دوسرے کا وہاں تذکرہ نہیں ہوتا، ایک نبی ہے جبکہ دوسرا امتی۔ اس حوالے سے دیگر مفسرین کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ مفتی محمد شفیع صاحب اس ضمن میں لکھتے ہیں:

'' هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ '' یعنی جب تم ذکر اللہ کی کثرت کے عادی ہوگئے، اور صبح وشام کی تسبیح پر مداومت کرنے لگے تو اس کا اعزاز واکرام اللہ کے نزدیک یہ ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل فرمائے گا اور اس کے فرشتے تمہارے لئے دعا کریں گے۔ آیت مذکورہ میں لفظ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور فرشتوں کے لئے بھی، لیکن مصداق صلوٰۃ کا الگ الگ ہے۔ اللہ کی صلوٰۃ تو یہ ہے کہ وہ رحمت نازل فرمائے اور فرشتے خود تو کسی کام پر قادر نہیں ان کی صلوٰۃ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے نزول رحمت کی دعاء مانگیں۔ صلوٰۃ اللہ کی طرف سے رحمت ہے اور فرشتوں کی طرف سے استغفار یعنی دعا مغفرت، اور باہم ایک دوسرے کی طرف سے دعا لفظ صلوٰۃ ان تینوں معنی کے لئے شامل ہے جو عموم مشترک جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ لفظ معنی میں مشترک ہے۔ اور تینوں مراد ہیں جو عموم مشترک کو قواعد عربیہ کی رو سے جائز نہیں سمجھتے وہ بطور عام مجاز کے ان سب معنوں پر لفظ صلوٰۃ کا اطلاق قرار دیں گے۔[58]

نیز مفتی صاحب نے ایک اور مقام پر لکھا ہے:

"لفظ صلوٰۃ عربی میں چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رحمت، دعا، مدح وثناء آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف جو نسبت صلوٰۃ کی ہے اس سے مراد رحمت نازل کرنا ہے۔ اور فرشتوں کی طرف سے صلوٰۃ ان کی آپؐ کے لئے دعاء کرنا ہے۔ اور عام مومنین کی طرف سے صلوٰۃ کا مفہوم دعاء مدح وثناء کا مجموعہ ہے۔ عام مفسرین نے یہی معنی لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ سے مراد آپؐ کی تعظیم اور فرشتوں کے سامنے مدح وثناء ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کی تعظیم دنیا میں تو یہ ہے کہ آپؐ کو بلند مرتبہ عطاء فرمایا کہ اکثر مواقع اذان و اقامت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ آپؐ کا ذکر شامل کر دیا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے دین کو دنیا بھر میں پھیلا دیا، اور غالب کیا، اور آپؐ کی شریعت پر عمل قیامت تک جاری رکھا، اس کے ساتھ آپؐ کی شریعت کو محفوظ رکھنے کا ذمہ حق تعالیٰ نے لے لیا۔ اور آخرت میں آپؐ کی تعظیم یہ ہے کہ آپؐ کا مقام تمام خلائق سے بلند و بالا کیا۔ اور جس وقت کسی پیغمبر اور فرشتے کو شفاعت کی مجال نہ تھی اس حال میں آپؐ کو مقام شفاعت عطاء فرمایا جس کو مقامِ محمود کہا جاتا ہے۔ اور ایک لفظ صلوٰۃ سے بیک وقت متعدد رحمت، دعاء، تعظیم وثناء مراد لینا جو اصطلاح میں عموم مشترک کہلاتا ہے، اور بعض حضرات کے نزدیک وہ جائز نہیں، اس لئے اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ لفظ صلوٰۃ کے اس جگہ ایک ہی معنی لئے جائیں۔ یعنی آپؐ کی تعظیم اور مدح وثناء اور خیر خواہی پھر یہ معنیٰ جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں تو اس کا حاصل رحمت ہوگا۔ اور

فرشتوں کی طرف منسوب ہوں تو دعاء و استغفار ہو گا۔ عام مؤمنین کیطرف منسوب کیا جائے تو دعاء اور مدح و ثناء و تعظیم کا مجموعہ ہو گا اور لفظ سلام مصدر بمعنیٰ السلامۃ ہے۔ جیسے ملام بمعنیٰ ملامت مستعمل ہوتا ہے اور مراد اس سے نقائص و عیوب اور آفتوں سے سالم رہنا ہے۔ اور السلام علیک کے معنیٰ یہ ہیں کہ نقائص اور آفات سے سلامتی آپ کے ساتھ رہے۔" [59]

اسی موضوع پر مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

'' يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ ۚ '' میں لفظ یصلی، اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت سے رحمت کرنے کے مفہوم میں ہو گا۔ اور ملائکہ کی طرف نسبت سے رحمت کی دعا کے مفہوم میں۔ نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے معنی میں تبدیلی کی مثالیں قرآن اور کلام عرب میں بہت زیادہ ہیں۔ یہی لفظ اسی سورۃ میں دو مختلف مفہوموں میں استعمال ہوا ہے۔ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (بے شک اللہ اپنے نبی پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں تو اے اہل ایمان تم بھی اس پر درود بھیجو) آیت کے آخر میں وکان بالمؤمنین رحیما بھی اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں یہ لفظ یصلی اللہ تعالیٰ کے لئے رحمت نازل کرنے ہی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اہل ایمان کے لئے فرشتوں کے استغفار کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ بھی آیا ہے ۔ مثلا:

'' الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ '' [60]

"وہ جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے ارد گرد ہیں' اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اہل ایمان کے لئے استغفار کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تیری رحمت اور علم ہر چیز کو وسیع ہے، تو ان لوگوں کی مغفرت فرما جنھوں نے توبہ اور تیرے راستہ کی پیروی کی اور ان کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔"

اسی طرح سورۂ شوریٰ میں بھی ہے۔

''وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ'' [61]

"اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور جو زمین میں ہیں ان کے لئے وہ استغفار کرتے ہیں"

ایک یہ کہ جس نبی کا مرتبہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی نظروں میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے اس پر رحمت کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں، حیف ہے اگر انسانوں میں سے کچھ لوگ اس کے درپے آزار ہوں در آنحالیکہ نبی ﷺ کا اصلی احسان انسانوں ہی پر ہے نہ کہ خدا اور اس کے فرشتوں پر۔

دوسری یہ کہ جو لوگ نبی ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں وہ نبی ﷺ پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ خدا اور اس کے فرشتوں کی ہم نوائی کر کے وہ اپنے کو سزاوارِ رحمت بناتے ہیں۔ جہاں تک نبی ﷺ کا تعلق ہے جب آپ کو اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعائیں حاصل ہیں تو دوسروں کی دعاؤں کے محتاج نہیں ہیں۔" [62]

10. بقولِ موصوف جبال سے مراد اہل جبال اور طیرہ ایک قوم کا نام ہے: ''وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُودَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فَاعِلِينَ'' [63] کے تحت لکھتے ہیں:

" ان جبال میں عمالقہ قوم رہتی تھی جس کو بنی اسرائیل جبارین کہتے تھے۔ وہ پہاڑوں کے رہنے والے جن تھے۔ داؤد علیہ السلام نے ان پر فتح حاصل کی اور انہیں قابو میں لے آئے۔ وہ دن بھر داؤد علیہ السلام کے ساتھ کام کرتے تھے۔ پچھلے پہر اور دن چڑھے داؤد علیہ السلام کیساتھ نمازیں پڑھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ سبا میں فرماتا ہے: یجبال اوّبی معہٗ و الطیر "[64] ہم نے پہاڑوں یعنی اہل جبال کو کہا کہ تم داؤد کے ساتھ سارا دن چلو پھرو اور قوم طیر کو بھی ان کے ساتھ کام میں لگا دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ داؤد علیہ السلام کے ساتھ چلا پھرا کرتے تھے۔ تاویب کے معنی ہیں ہمہ روز گشتن۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام پہاڑوں کا نہیں ہے بلکہ پہاڑ والوں کا ہے۔ (اسی طرح لکھا ہے) شام میں ایک شہر ہے جسے طیر (Tyre) کہتے ہیں وہاں طیر قوم بستی تھی۔" [65]

اسی طرح سورۃ النمل (مضمون نظم و ربط) کے تحت "الطیر" کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

" طائر طیران سے اسم فاعل ہے۔ طیران کے معنی ہیں سرعت سیر۔ الطائر ہو سریع السیر۔ اس معنی میں یہ لفظ انسانوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ تیز رو گھوڑوں کا نام طیار رکھا جاتا ہے۔ تیز رو آدمیوں کو بھی طیار کہا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے جاسوسوں کو طائر ہی کہتے تھے"۔ [66]

نیز یا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ کا ترجمہ و تفسیر یوں کرتے ہیں۔

"اے پہاڑو (یعنی اے پہاڑ کے رہنے والو) چلا کرو (دن بھر) اس (داؤد) کے ہمراہ اور (تم بھی اے) طیرو (یعنی اے جاسوسوں اور مخبروں فرمانبرداری کیا کرو۔ جس کو جس کام پر لگادیں وہ حکم بجالایا کرو۔ خدا نے اپنے فضل سے عمالقہ کا کوہستانی علاقہ داؤدؑ کے ماتحت کر دیا۔ آپ نے ان کی نگہداشت پر مخبر لگادئے کہ اگر کوئی سازش وغیرہ کریں تو ان کو مناسب سزا دی جائے، یا جو حالات کا تقاضا ہو وہ کیا جائے۔"[67]

ایک اور مقام پر "طیر" کی تشریح یوں کرتے ہیں:

" اور طیر بھی (جو کئی شہروں سے) اکٹھے کئے ہوئے تھے (اُن کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور وہ) سب کے سب (داؤدؑ اور عمالیق و طیر وغیرہ) اُس (خدا) کی طرف (نہ کہ داؤدؑ کی طرف) رجوع کرنے والے (یعنی اوّاب) تھے۔

(طیر دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک پر دار جانور اور دوسرے بے پَر جانور' یعنی انسان۔ طیر، تیز رو، جلدی چلنے والا اور طائر' پروں والا۔ غرض یہ طیر یعنی فوجی لوگ جن کو جنّ و انسان بھی کہا گیا ہے' یہی سلیمانؑ کو داؤدؑ سے وراثت میں ملے تھے۔ ہُدہُد بھی انہیں میں سے تھا، نہ کہ جانور تھا، یہ سب لوگ نیکوکار تھے"۔[68]

سوال یہ ہے کہ اگر پہاڑ کے لوگ حضرت سلیمانؑ کے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے تو اس میں آپؑ کی کیا خصوصیت رہی۔ کہ آپؑ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور اہل جہاں بھی اسی رب کی عبادت کرتے تھے، اور اس نماز باجماعت میں جہاں سلیمانؑ خود شریک ہوتے، اسی طرح اہل جہاں بھی شرکت کرتے، لہٰذا اس سے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت سلیمانؑ پر کسی خاص نعمت کا اظہار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں جبال سے مراد پہاڑ ہی ہے، اہل جبال نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:

" یا جِبَالُ أَوِّبِي ، اوبی تاویب سے مشتق ہے جس کے معنی دہرانے اور لوٹانے کے آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو حکم دیا تھا کہ جب حضرت دوؤدؑ اللہ کا ذکر و تسبیح کریں تو پہاڑ بھی وہ کلمات پڑھ کر لوٹائیں۔ اسی طرح ابن عباسؓ نے اوبی کی تفسیر سبّحی سے فرمائی ہے (ابن کثیر) یہ پہاڑوں کی تسبیح جو حضرت داؤدؑ کے ساتھ کرتے تھے۔ اس عام تسبیح کے علاوہ ہے جس میں کل مخلوقات شریک ہیں۔ اور جو ہر

جگہ ہر وقت ہر زمانے میں جاری ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا '' وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ''[69] یعنی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح نہ پڑھتی ہو مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔ یہاں جس تسبیح کا ذکر ہے وہ حضرت داؤدؑ کے معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے یہ ظاہر ہے کہ اس تسبیح کو عام سننے والے بھی سنتے سمجھتے ہوں گے ورنہ پھر معجزہ ہی نہ ہوتا۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ داؤدؑ کی آواز کے ساتھ پہاڑوں کا آواز ملانا اور تسبیح کو دہرانا آواز بازگشت کے طور پر نہ تھا جو عام طور پر گنبد یا کنویں وغیرہ میں آواز دینے کے وقت آواز کے لوٹنے سے سنی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے اس کو حضرت داؤدؑ پر خصوصی فضل و انعام کی حیثیت میں ذکر فرمایا ہے آواز بازگشت میں کسی کی فضیلت و خصوصیت سے کیا تعلق ہے وہ تو ہر انسان چاہے کافر ہی ہو بازگشت کی جگہ میں اس کی آواز بھی لوٹتی ہے۔

والطیر، یہ لفظ نحوی ترکیب میں سخر نا محذوف کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ معنٰی یہ ہے کہ ہم نے پرندوں کو حضرت داؤدؑ کے لئے مسخر کر دیا تھا۔ مراد اس تسخیر سے یہ ہے کہ پرندے بھی آپ کی آواز پر ہوا میں جمع ہو جاتے۔ اور آپ کے ساتھ پہاڑوں کی طرح تسبیح کرتے تھے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں مذکور ہے، إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً ،[70] یعنی ہم نے پہاڑوں کو داؤدؑ کا مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام ان کے ساتھ تسبیح کیا کریں اور پرندوں کو بھی مسخر کر دیا۔" [71]

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

'' يا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ ۔ یہ اشارہ ہے اس سوز و گذار کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو عطا فرمایا تھا کہ جب وہ پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر اپنے خاص لاہوتی لحن میں اپنے رب کی حمد کا ترانہ چھیڑتے اور اپنی منظوم مناجاتیں پڑھتے تو شجر و حجر اور چرند پرند سب جھوم اٹھتے اور ان کی ہم نوائی کرتے۔

تادیب کے اصل معنی ترجیع کے ہیں یعنی کسی کے سُر میں اپنا سُر ملانا، اس کی آواز کو دہرانا، اس کی ہم آہنگی اور ہم نوائی کرنا۔ یوں تو اس کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے اور جب وہ تسبیح کرتی ہے تو لازماً تسبیح کرنے والوں کی ہم نوائی بھی کرتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت داؤد کو خاص نوع کا دل گداختہ اور خاص قسم کا لحن عطا فرمایا تھا۔ اسی طرح اپنے خاص حکم سے پہاڑوں اور پرندوں کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ جس وقت حضرت داؤد اپنے ربّ کی حمد و تسبیح کریں، وہ بھی ان کے ساتھ اس میں

شریک ہوں۔ سورہ انبیاء میں یہی مضمون یوں ادا ہوا ہے۔و سخرنا مع داؤد الجبال و الطیر[72] اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا اور پرندوں کو بھی "۔

مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

"و سخرنا مع داؤد الجبال و الطیر" اس آیت میں پہاڑوں اور پرندوں کے حضرت داؤدؑ کے ساتھ شریکِ تسبیح ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کی تشریح سورہ انبیاء اور سورہ سباء میں گزر چکی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کو باری تعالیٰ نے یہاں اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ یہ حضرت داؤدؑ پر ایک خاص انعام تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ حضرت داؤدؑ کے لئے نعمت کیسے ہوئی؟ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سے کیا خاص فائدہ پہنچا؟ اس کا جواب تو یہ ہے کہ اس سے حضرت داؤدؑ کا ایک معجزہ ظاہر ہوا، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا انعام ہے۔[73]

دراصل خواجہ احمد الدین امرتسری دوران تفسیر اپنے عقل اور عربی لغت کا سہارا اس لئے لیتے ہیں کہ وہ احادیث نبویہ کو تفسیر قرآن کے مآخذ کے طور پر ہرگز تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اس کو وحی اور حجت مانتے ہیں۔ اس ضمن میں موصوف اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

I. "قرآن مجید کی وہ تفسیر جس کا وحی کے ساتھ لانا ضروری ہے قرآن میں ہی آگئی ہے۔ قرآن کی کوئی وحی والی تفسیر قرآن کے باہر نہیں پائی جاسکتی"۔[74]

II. " قرآن کی کامل اور متحد کر دینے والی تعلیم کے آجانے کے بعد کسی تشریعی وحی کی ضرورت نہیں۔ وہ تمام قرآن میں ہی آگئی ہے۔ باقی معاملات کا فیصلہ خود قرآن نے شوریٰ پر ڈالا ہے"۔[75]

III. " پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی میں آگئی ہے۔ قرآن کے نزدیک قرآن کی وحی والی تفسیر کا قرآن میں ہی لایا جانا ضروری ہے۔ غیر وحی تفسیر میں تمام عقلمندوں کا ایک ہی حال ہے"۔[76]

قرآن پاک نے خود یہ وضاحت کی ہے کہ تبیین قرآن رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی میں سے ہے۔ ارشاد ہے:

'' وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ '' [77]

" اور ہم نے یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے واضح کر دو وہ (دین الٰہی) جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔"

اس آیت کی رو سے یہ آپ ﷺ کا فرض ہے کہ اپنے قولی و عملی بیان کے ذریعے سے قرآن میں جو بات مجمل ہے اس کی تفصیل کریں اور جو مبہم ہے اس کی وضاحت کریں۔ لہٰذا قرآن کریم پر عمل کرنے کے لئے اتباعِ رسول لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

" قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ "[78]

"کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرتے ہو تو میری تابعداری کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمائے گا"۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے لئے معیار نبی کریم ﷺ کی تابعداری میں حصر کیا ہے کیونکہ شرط و جزاء جملہ شرطیہ میں اکثر حصر کے لئے آتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کے دعویدار ہیں اور یہ محبت ثواب کے لئے مستلزم ہے یعنی جو شخص اپنے اعمال پر ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے ان سب کے لئے ذریعہ اور معیار نبی کریم ﷺ کی تابعداری کرنا ہے۔

اتباع اور اطاعت دو الفاظ ہیں۔ یہ دونوں الفاظ جب قرآن کریم میں الگ الگ مواضع پر مستعمل ہوں تو وہاں اطاعتِ رسول اتباع کو شامل ہوتا ہے اور اتباع اطاعت کو شامل ہوتا ہے۔ اور جب ایک ہی جگہ استعمال ہو جائیں تو اطاعت کا اطلاق اقوال کے ساتھ خاص ہو گا اور اتباع کا اطلاق اعمال کے ساتھ خاص ہو گا۔ اتباع کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنے اور عمل کرنے کے ہیں۔ ان دونوں الفاظ کا یکجا استعمال سورۂ طٰہٰ میں ہے:

" فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي "[79]

" میرے طریقے پر عمل کرو اور میری بات مان لو"۔

تو اتباع کے معنی ہیں اعمال میں نبی کریم ﷺ کی پیروی کرنا۔ اور اطاعت کے معنی ہیں اقوال کو ماننا۔ پس جب اتباع اعمال میں ہے اور عمل میں تو اللہ تعالیٰ کی پیروی (یعنی اللہ تعالیٰ جیسا عمل کرنا) ممکن نہیں، اس وجہ سے لفظِ اتباع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ رسول ﷺ کے اتباع کا حکم ہوا۔ اور اطاعت اقوال میں ہے، تو اللہ تعالیٰ کا قول قرآن ہے اور رسول ﷺ کا

قول حدیث ہے۔ لہٰذا دونوں کے ساتھ اطاعت کا ذکر کیا گیا۔ پس جو شخص قرآن کریم پر عمل کرنا چاہتا ہے' اس کے لئے نبی اکرم ﷺ کی تابعداری کرنا فرض ہے۔

درج بالا تمہید سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اعمالِ نبی ﷺ کا اتباع ہم پر لازم ہے اور نبی کریم ﷺ خود وحی کا اتباع کرتے تھے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

'' إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَـــا يُوحَى إِلَيَّ ''[80]

" میں تابعداری نہیں کرتا مگر اُس کے کی جو مجھے وحی دی گئی ہے"۔

'' قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَى إِلَيَّ مِنْ رَبِّي ''[81]

"کہہ دیجئے بے شک میں صرف اس کی تابعداری کرتا ہوں جو مجھے دی گئی ہے میرے ربّ کی طرف سے"۔

" واتبع ما يوحى اليک ''[82]

" اور تابعداری کرو اس کی جو تجھے تیرے ربّ کی طرف سے وحی کی جاتی ہے"۔

درج بالا آیات میں ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا امر تھا کہ وحی کی تابعداری کرو۔ اور آپ ﷺ نے بھی صرف وحی کی تابعداری کی ہے۔ اتباع چونکہ عمل کے ساتھ مخصوص ہے' پس ثابت ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے تمام نبوی زندگی میں وحی کے مطابق اعمال کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کے ان اعمال کا تذکرہ اور ان کی تفصیل احادیث میں محفوظ ہے لہٰذا وہ بھی وحی ہے۔ لہٰذا عمل بالقرآن کے لئے ہم آپ ﷺ کے احادیث مبارکہ سے کسی طور پر مستغنی نہیں ہوسکتے۔ اب جو شخص نبی کریم ﷺ کے احادیث کو حجت تسلیم نہیں کرتا وہ قرآن کریم میں درج" فاتبعونی " پر ایمان نہیں رکھتا۔ ایمان رکھنے والا تو وہ ہوگا جو احادیث میں آپ ﷺ کے اعمال کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کی پیروی کرے گا۔

حواشی ومراجع

[1] امام محمدؒ:(م ۱۸۹ھ) آپؒ امام ابو حنیفہؒ کے نہایت قابل اعتماد شاگرد تھے۔ امام صاحب کی وفات (۱۵۰ھ) کے بعد مزید تکمیل امام ابو یوسفؒ سے کی، اور اس کے بعد امام مالکؒ سے بھی مؤطا سنا۔ کثیر التصانیف ہیں۔ مؤطا امام محمدؒ آپ ہی کے نام سے معنون ہے۔ (علامہ خالد محمود، آثار الحدیث، ج ۲، ص ۲۸۷۔)

[2] الزرکشی، نام ابو عبداللہ بدرالدین محمد بن بہادر الزرکشی ہے۔ آپ شافعی المسلک تھے اور کثیر التصانیف تھے۔ شذرات الذہب، ص ۳۳۵۔

[3] السیوطی، البرھان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۱۶۰، نوع نمبر ۴۱ " اُمہات مآخذ التفسیر "۔

[4] مولوی نور الحسن نیر، نور اللغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، طبع دوم ۱۹۸۵ء، ج ۱، ص ۲۷۰۔

[5] محمد ابو سلامہ، منہج الفرقان، مسبطع شبر اً، ۱۹۳۸ء، ج ۱، ص ۳۶۔ مناہل العرفان، ج ۱، ص ۵۳۶۔

[6] سورۃ یوسف : ۲۔

[7] سورۃ الشعراء:۱۹۵۔

[8] القزوینی، محمد ابو عبد اللہ ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ (مترجم)، ج ۱، ص ۸۸۴، رقم:۱۷۸۷، اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۹۰ء۔

[9] اُم سلمہؓ: ہند نام، ام سلمہ کنیت، قریش کے خاندان مخزوم سے ہیں۔ سلسلہ النسب ہند بنت ابی امیہ سہیل بن المغیرہ بن عبد اللہ بن عمر مخزوم، والدہ کا نام عاتکہ تھا، جو بنو فراس سے تھی۔ حبشہ پھر مدینہ ہجرت کی۔ شوال ۴ھ کے اخیر میں نبی ﷺ کے ساتھ نکاح ہوا۔ حرہ کے واقعہ کے سال یعنی ۶۳ھ میں آپؓ نے انتقال کیا۔ اس وقت عمر ۸۳ برس تھی۔ (طبری کبیر، ج ۳، ص ۲۴۴۳)

[10] سنن ابو داؤد (مترجم)، ج ۱، ص ۵۸۰، رقم:۱۵۵۰، اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۸۳ء۔

[11] احمد الدین امرتسری: خواجہ احمد الدین امرتسری بن خواجہ میاں محمد بن محمد ابراہیم۔ ۱۸۶۱ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے، انہیں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں مہارت حاصل تھی۔ بیان للناس کے نام سے ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔ حجیت حدیث کے منکر اور نیچری ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں فوت ہوئے۔ (ماہنامہ بلاغ امرتسر، خواجہ نمبر، ستمبر ۱۹۳۶ء)

[12] احمد الدین امرتسری، بیان للناس، ج ۱، ص ۱۵۵، دوست ایسوسی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

[13] ایضاً، ج ۵، ص ۱۹۶۔

[14] ایضاً، ج ۱، ص ۴۲۔

[15] ایضاً، ج ۵، ۲۴۲۔

[16] صوفی غلام مصطفی تبسم: خواجہ احمد الدین امرتسری کے سرکردہ پیروکاروں میں سے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ ۱۹۲۹ء میں جب خواجہ صاحب نے جماعت " امت مسلمہ " کی بنیاد رکھی تو غلام مصطفی تبسم اس کے پہلے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ (ماہنامہ البلاغ، امرتسر، خواجہ نمبر)

[17] صوفی غلام مصطفی تبسم، تعارف، بیان للناس، ج ۱، ص ۵۔

[18] محمد حسین عرشی: محمد حسین عرشی: ۱۸۹۲ میں پیدا ہوئے۔ احمد الدین امرتسری کے پیروکاروں میں سے تھے۔ طبیب، ادیب اور شاعر تھے۔ عربی ادب مولانا محمد عالم آسی سے اور تفسیر خواجہ احمد الدین امرتسری سے پڑھی۔

[19] محمد حسین عرشی، سر آغاز، بیان للناس، ج ۱، ص ۲۔

[20] العنکبوت:۱۴

[21] بیان للناس، ج ۵، ص ۱۷۶، ۱۷۷۔

[22] البقرہ:۹۶

[23]ابن کثیر، پورا نام عماد الدین اسماعیل بن عمرو بن کثیر دمشقی ہے۔ آپ ۷۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۷۴ھ میں وفات پائی۔ شافعی المسلک تھے۔ امام ابن تیمیہ کے نامور تلامذہ میں سے ہیں۔ اپنے زمانے کے یکتائے روزگار فاضل اور حافظ حدیث تھے۔ (طبقات المفسرین لداؤدی، ص ۲۲۷)۔

[24]حافظ عماد الدین، ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر (مترجم اردو)، ج ۴، ص ۱۳۰۔

[25]مفتی محمد شفیع: مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع بن مولانا محمد یاسین دیوبند میں ۱۳۱۴ھ کو پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ستر ہزار (۷۰۰۰۰) سے زائد فتوے صادر کئے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ تفسیر معارف القرآن آٹھ جلدوں میں آپ کی زبردست یادگار ہے۔ ۸۳ سال کی عمر میں ۱۳۹۶ھ میں دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ (البلاغ، مفتی نمبر، ص ۳۳۳۔۳۴۶، مولانا محمد تقی عثمانی، دارالعلوم کراچی)۔

[26]مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ج ۶، ص ۶۸۰، ۶۸۱، ادارہ معارف کراچی۔

[27]امین احسن اصلاحی، مولانا محمد امین احسن اصلاحی ۱۹۰۴ء میں ضلع اعظم گڑھ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تعلیم حاصل کی۔ آپ مولانا حمید الدین فراہی کے خصوصی شاگردوں میں سے ہیں جنہوں نے اُن کے مکتبہ فکر آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تفسیر تدبر قرآن کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ (برصغیر میں اُردو تفاسیر کا ارتقاء، در ثمینہ، ص ۸۰، ۸۱)۔

[28]امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، ج ۶، ص ۲۵، ۲۸۔

[29]یٰسین: ۲۰۔

[30]القصص: ۲۰۔

[31]بیان للناس، ج ۴، ص ۱۵۔

[32]ایضاً، ص ۱۶

[33]تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۱۵۸۔

[34]معارف القرآن (مفتی شفیع)، ج ۵، ص ۴۴۰، ۴۳۷۔

[35]بیان للناس، ج ۴، ص ۲۷۸۔

[36]ایضاً، ۲۷۹۔

[37]مولانا عبد الرشید نعمانی، لغاتِ قرآن (فہرست الفاظ)، دار الاشاعت کراچی، ج ۴، ص ۸۶۔

[38]بیان للناس، ج ۴، ص ۳۰۳۔

[39]صحیح بخاری (۵/۲۲۳۸)

[40]بیان للناس، ج ۳، ص ۲۰۳۔

[41] ھدایہ ۱: ۹۴ مطبوعہ دھلی، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۰، ص ۴۸۷، دانش گاہ پنجاب لاہور۔

[42]المؤمنون: ۱۱

[43]بیان للناس، ج ۴، ص ۳۰۴۔

[44]صحیح مسلم، کتاب الزہد، ج ۶، ص ۴۷۷، الترمذی (۴/۵۶۱)، تحقیق: الشیخ احمد شاکر، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ط، د۔

[45] صحیح بخاری (۶/ ۲۷۰۰)، مسند احمد (۲/ ۳۳۵)

[46] حم السجدہ:۳۲،۳۱

[47] ق:۳۵

[48] الروم:۶

[49] بیان للناس، ج۵، ص۲۰۸۔

[50] حضرت مصعب بن عمیرؓ: ابتدائی اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ نوعمری میں بڑے ناز و نعم کے پلے ہوئے تھے۔ گھر والوں سے چھپ کر اسلام لائے اور اس کی خاطر بہت مصائب جھیلیں۔ مدینہ سے حج کے لئے آئے ہوئے چند افراد منیٰ کی گھاٹی میں مسلمان ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ہمراہ اسلام کی تبلیغ و تعلیم کے لئے بھیجا۔ آپ کی کوششوں سے بہت سارے لوگ مسلمان ہوئے اور مدینہ میں ہجرت کی فضا ساز گار ہوئی۔ سن ۳ھ میں غزوہ احد میں شہادت نصیب ہوئی۔ (الاصابہ، طبقات ابن سعد)

[51] آل عمران:۱۱۰

[52] الاحزاب:۴۳

[53] بیان للناس، ج۵، ص۳۶۷۔

[54] الاحزاب:۵۶

[55] ایضاً:۴۳

[56] البقرہ:۳۰

[57] بیان للناس، ج۵، ص۳۸۰،۳۷۹۔

[58] معارف القرآن (مفتی شفیع)، ج۷، ص۱۷۵۔

[59] ایضاً، ص۲۲۲،۲۲۱۔

[60] المؤمن:۷۰

[61] الشوریٰ: ۵

[62] اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، ج۶، ص۲۶۷، ۲۴۰

[63] الانبیاء:۷۹

[64] سباء:۱۰

[65] بیان للناس، ج۲، ص

[66] ایضاً، ج۵، ص۶۱

[67] ایضاً، ص۳۹۷،۳۹۶۔

[68] ایضاً، ج۶، ص۵۵

[69] بنی اسرائیل :۴۴

[70] ص:۱۸،۱۹

[71] معارف القرآن (مفتی شفیع)، ج۷، ص۲۶۰،۲۶۱۔

[72] تدبر قرآن، ج۶، ص۳۰۰

[73] معارف القرآن (مفتی شفیع)، ج۷، ص۴۹۶۔

[74] بیان للناس، ج۴، ص۳۹۳۔

[75] ایضاً، ص۳۹۹۔

[76] ایضاً، ج۵، ص۱۰۷۔

[77] النحل:۴۴

[78] آل عمران:۳۱

[79] طٰہٰ:۹۰

[80] یونس:۱۵

[81] الاعراف:۲۰۳۔

[82] الاحزاب:۲